

مولانا سید محمد رابع ندوی - ناظم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

دینی مدارس اور ان کا نصاب

مدارس عربیہ کا نصاب دراصل مسلمانوں کی گزشتہ صدیوں میں رائج نصاب درس سے ماخوذ رہا ہے۔ یہ قدیم نصاب اگرچہ گزشتہ صدیوں میں حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتا رہا تھا اور مضامین کے سلسلہ میں کمی و بیشی کا عمل جاری رہا تھا لیکن معقولات کی جو اہمیت چوتھی پانچویں صدی ہجری سے عالم اسلام کے علمی حلقوں میں پیدا ہو گئی تھی، وہ اس میں جاری رہی۔ اس کے اثر سے ذہنوں میں بحث و جدل کا مزاج بننا تھا اور عملی اور تجربی علوم کی رغبت کم ہوتی تھی۔ نیز علوم دینیہ کی بھی جو کتابیں تصنیف ہوئیں، ان کا طرز بیان معقولات سے متاثر رہا۔

برصغیر میں بھی گزشتہ صدیوں میں یہی طرز غالب رہا۔ اخیر میں درس نظامی کے نام سے جو نصاب رائج ہوا، وہ اصلاً "ملائم نظام الدین فرنگی علی" کا اختیار کردہ تھا اور اس میں معقولات کو وسیع مقام دیا گیا تھا۔ اس میں علوم دینیہ میں حدیث کو بھی وہ وسعت حاصل نہیں تھی جو اس کے لائق و مناسب تھی لیکن اس کمی کو متعدد علماء حق نے محسوس کیا جن میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی توجہ کا بڑا حصہ تھا، چنانچہ علماء حق کی اس توجہ سے صحاح ستہ کی تعلیم کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی اور نتیجتاً ان کو بالاستیعاب ایک سال میں پڑھا دینے کا سلسلہ شروع ہوا جو تمام مدارس دینیہ میں رائج ہو گیا۔

مذکورہ بالا گزشتہ عہد پوری اسلامی دنیا کے لیے سخت انحطاط اور علمی لحاظ سے جمود کا زمانہ تھا، مغربی قومیں ترقی کر رہی تھیں اور مشرقی قوموں پر غالب آتی جا رہی تھیں، مسلمانوں نے مفید اور تقاضائے وقت کے مطابق اپنے کو تیار کرنے اور ضرورت کے علوم و معارف سے واقف ہونے کی طرف توجہ ختم کر دی تھی اور نصاب درس کے معاملہ میں بھی کسی بڑی تبدیلی کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر پا رہے تھے۔ ایسے میں مغربی قوموں کے غلبہ نے اور بھی خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کا چراغ ٹھٹھانے لگا تھا، اور ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کو مختلف میدانوں میں ابھرنے اور اپنی صفیں مضبوط کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے تمام مسلمانوں کو مل جل کر کام لینا پڑا۔

کی ضرورت تھی لیکن وہ جمود اور محدودیت کا شکار تھی۔

لیکن پھر بھی مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے سبب سے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کو عقائدی اور اخلاقی سطح پر جو زبردست چیلنج کا سامنا کرنا پڑنے لگا تھا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس وقت کے علماء و مصلحین نے جن میں خاص طور سے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے خاندان کے ذی علم افراد تھے، خاص توجہ صرف کی اور اس جدوجہد کو اس وقت کی جو علمی و تعلیمی بنیاد درکار تھی، وہ میا کی۔ ان کی کوشش سے علم و تعلیم سے جو دلچسپی بڑھی، اسی سے موجودہ دینی مدارس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے لیے اس وقت جو نصاب تعلیم اپنایا گیا، اس میں کتب اللہ و سنت رسول اللہ کی صحیح اور موثر تعلیم، مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرہ کو اسلامی بنانے کی ضرورت کے لائق مضامین و کتب نیز عقائد صحیحہ کو غلط اور گمراہ طریقے سے پیش کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے والے علوم بھی شامل کیے گئے، ان کے اور علوم شرعیہ کے ساتھ حسب سابق علوم عقلیہ و آلیہ کو بھی شامل نصاب رکھا گیا، اس نصاب کو تقویت و رواج زیادہ تر دارالعلوم دیوبند میں اس پر عمل کیے جانے سے ہوا۔ دارالعلوم دیوبند جس کو اپنے وقت کے عظیم عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پروان چڑھایا اور ان کے رفقاء کے تعاون سے اس کو عظمت و شہرت حاصل ہوئی، وہ سب حضرات اپنے وقت کے شیوخ اور بزرگ تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی اور ان کے بعد کے بزرگ علماء مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا قاری محمد طیب صاحب قاضی وہ بزرگ علماء تھے کہ جن کے کلام اور اقدام میں اثر و برکت تھی۔ وہ کسی معمولی سے معمولی نصاب کو چلاتے تو اس سے بھی موثر نتائج نکلتے کیونکہ ان کی بات میں اثر تھا، ان کی ہدایت و نصیحت میں اثر تھا، ان کی تعلیم و تربیت میں اثر تھا۔ ان کے اثر سے اسی دارالعلوم دیوبند کو دور دور تک شہرت ہوئی اور وہاں آنے والے طلباء درس گاہ کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ وہاں کے ان عالی قدر مدرسین سے ہمت و قوت و جذبہ حاصل کرتے رہے جو ان کی عملی زندگی میں دوسروں کے فیض کا بھی باعث بنا رہا لیکن جہاں تک نصاب کا تعلق تھا، اس میں وقت اور حالات کے لحاظ سے جو کمی پائی جاتی تھی، اس کو دور کرنے سے وہ نصاب اور زیادہ مفید اور ملت کی ضرورت کو پورا کرنے والا بن جاتا جس کو تقریباً محسوس نہیں کیا گیا۔

حالانکہ تفسیر و حدیث و فقہ جو علوم عالمہ کے عنوان میں داخل تھے، ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہ تھی البتہ علوم الیہ نحو و صرف و ادب کی تعلیم کے تجربات میں آئے

ہوئے طریقوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور علوم عقلیہ کی مقدار میں فرق کر کے ملت کی ضرورت کے علمی و اجتماعی پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے مضامین کا ضروری حصہ داخل کیا جا سکتا تھا لیکن بزرگوں کی برکت سے جو نفع حاصل ہو رہا تھا، اس کی روشنی میں مذکورہ بالا ضرورت کو ٹھیک سے محسوس نہیں کیا جاسکا اور اسی نصاب کو برابر قائم رکھا گیا۔ اس کے اثر سے نصاب تعلیم کے یہ مشمولات تقریباً تمام مدارس اسلامیہ دینیہ میں رائج رہے، اس نصاب میں زیادہ اور تفصیلی طریقہ سے زور صرف چار موضوعات پر دیا گیا۔ ایک حدیث دوسرے فقہ، تیسرے تفسیر اور چوتھے معقولات و قواعد عربی۔ پورا نصاب تقریباً ان ہی چار موضوعات پر مشتمل رکھا گیا، اس نصاب کو پڑھ کر انہی علوم میں جید علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی عقائد کی ترویج کی اور مسلمانوں کی زندگی اصلاح کی اور گمراہ کرنے والے لوگوں کی کوششوں کا مقابلہ کیا اور ان کا ابطال کیا۔ آج ملک میں عقائد صحیحہ کے بقاء اور صحیح مذہبی زندگی کے رواج میں ان اسلاف کی ان کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ یہ وقت جبکہ ملک میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھ رہا تھا اور ان کی حکومت سے مسلمانوں کے لیے بڑے خطرات محسوس کیے جانے لگے تھے، اسلام و ملت اسلام کے تحفظ کے لیے جو کوششیں جاری تھیں، ان کے لیے بھی خطرات پیدا ہونے لگے۔ یہ بدیسی حکومت مسلمانوں کے ملکوں میں سیاسی سطح پر نہ صرف یہ کہ اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی بلکہ تہذیبی اور علمی طور پر بھی سخت اثر انداز ہو رہی تھی، اس کی تہذیب کا غالب قوم کی تہذیب کی حیثیت سے اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے سامراجی مقاصد سے ذہنوں کو بدلنے اور اپنی مصلحتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اپنا مخصوص تعلیمی نظام بنایا اور اس کو رائج کیا۔ چونکہ اس تعلیمی نظام سے دنیاوی وجاہت اور ترقی حاصل ہوتی تھی، اس لیے باوجود اس کی مضرتوں کی طرف توجہ دہانی کے مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لیے یہ نظام تعلیم قابل قبول بن گیا، چنانچہ نئی نسلوں کے لوگ اس کی طرف غول در غول جانے لگے۔ اس طرح مسلمانوں میں دو نظام تعلیم جاری ہو گئے۔ ایک کا محور خالص علم دین تھا، دوسرے کا محور خالص دنیا۔ یہ دو دھارے بن گئے، دینی تعلیم کا دھارا صرف دینی، اور دنیاوی تعلیم کا دھارا دنیاوی دائرے میں چلنے لگا۔

علمائے اسلاف نے اسلامی زندگی کی حفاظت اور عقائد صحیحہ کی ترویج و دفاع کے لیے اپنے نظام تعلیم میں جو حق رکھا تھا، اس میں اصلاً گمراہ فرقوں اور علمائے سوء کے مقابلہ کا انتظام تھا چنانچہ اپنے اس تعلیمی نظام سے اس کے لائق علماء تیار کئے جن کی بڑی دینی خدمت ہیں۔ لیکن استعماری طاقتوں کے اثر و نفوذ کے نتیجے میں اسلامی ثقافت

وہب کو نقصان پہنچانے اور ذہنوں سے ان کے اثرات ختم کرنے کی کوششوں کے مقابلہ کے لیے اس نصاب میں انتظام نہ تھا، مثلاً تمدنی علوم، قوموں کی تاریخ نیز موثر و رائج زبان، سیاست و اقتصاد و جدید علوم کا کوئی نظم نہ تھا کہ اس کے ذریعہ دشمن کے تفوق کا مقابلہ کرنے کے اوزار ملتے۔ البتہ اس کمی کو ان میں سے متعدد علماء نے محسوس کیا اور حتی الوسع اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی۔ ان کی اس فکر و توجہ سے مسلمانوں کے نصاب میں اس کی ضرورت کے لیے جگہ نکالنے کی کوشش شروع ہوئی۔ یہ کوشش ایک دعوت و فکر کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ندوۃ العلماء نامی ادارہ کے نام سے اس نے کام شروع کیا۔ یہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء کا زمانہ تھا۔

ان کی تجویز نصاب میں فکری و ثقافتی و انسانی ضرورت کے مضامین اور عہد کے مطابق زبان و ادب کی صلاحیت پیدا کرنے والے موضوعات بھی پیش نظر تھے۔ اس دائرے میں عربی زبان کو وسیع اور اہم جگہ دی گئی تھی، تاکہ اس میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ممکن ہو جو ملت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کے درمیان ربط کا ذریعہ ہے اور علوم اسلامیہ سے گہری واقفیت کا وسیلہ بننے کے ساتھ دعوتی زندگی میں استعمال بھی کی جاسکے کیونکہ عربی زبان اسلام کی بنیادی زبان ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی درمیانی واسطہ کی زبان بھی ہے جس پر علماء کو عملی عبور رکھنا ضروری امر ہے۔ ثقافتی و انسانی ضرورت کے موضوعات میں تاریخ رکھی گئی، تاریخ درحقیقت ایک وسیع الاطراف موضوع ہے جس میں قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ، ثقافت و تمدن کی تاریخ، دعوت و فکر اسلامی کی تاریخ، استعماری طاقتوں کی سیاسی قوت اور علمی و فکری غلبہ کی تاریخ، مسلمانوں کے آغاز تمدن و غلبہ کی تاریخ، پھر ان کے زوال و شکست خوردگی کی تاریخ، جس میں ان کے اسباب و پس منظر شامل ہیں۔ تاریخ کے علاوہ علمی و فکری میدان میں اس صلاحیت کا پیدا کرنا جس سے قرآن و حدیث، سیرت طیبہ پر مستشرقین کے شرارت آمیز حملوں کو سمجھنے اور پھر ان کا علمی جواب دینے کے قابل بنایا جاسکے اور ایسے مفکرین و داعی پیدا کیے جاسکیں جو دین کا دفاع ہی نہیں بلکہ علم و تحقیق کی راہ سے حملہ آوروں کو شکست دے سکیں۔ اس کے لیے اپنے مقابل کی زبانوں سے ضروری واقفیت اور استعمال کی قدرت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک طرف خود اپنے ملک و قوم میں رائج الوقت زبان پھر یورپ کی غالب قوم کی زبان سے واقفیت، جس کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو فروسودہ اور ازکار رفتہ بلکہ احقانہ قرار دینے کا عمل جاری ہو رہا تھا۔ پھر صرف غیر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی نئی نسل

اپنا رہی تھی۔ اس پر عبور حاصل کر کے مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم یافتہ اکثریت کو ان منحرف خیالات و معلومات سے بچانے کا کام انجام دیا جاسکتا تھا۔ اس میں ثقافت و ادب پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ انگریزی زبان و ادب سے واقفیت کی بڑی اہمیت تھی۔ زبان کے علاوہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے ضروری علمی معلومات جیسے جغرافیہ اور عمرانی و ثقافتی علوم اور دیگر اہم عصری موضوعات بھی ضروری تھے۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات یہ بتا رہے تھے کہ کسی بھی زندہ قوم کے نصاب تعلیم میں ان مذکورہ بالا پہلوؤں کو نظر انداز کرنا قوم کو اس کی باعزت زندگی سے محروم رکھنے کے مساوی ہے اور قوم کو قائدانہ صف کے بجائے پچھلی صف میں تابع بن کر رکھنے کی طرف لے جانے والی بات ہے۔

نصاب کی تشکیل میں وسیع النظری کی ضرورت

نئے عہد کی ترقیات اور جدید علوم کے رواج سے یہ بات حقیقت بن گئی ہے کہ بغیر ان علوم کو جاننے ان کے شر کا مقابلہ اور اپنی دینی اور اخلاقی اقدار کا دفاع کرنا دشوار ہے۔ کوئی بھی قوم ہو، اپنے صرف مخصوص علمی دائرے کے اندر محدود رہے گی تو دوسری قوموں اور ان کی ترقیات سے ناواقفیت کی بنا پر نقصان اٹھائے گی۔ مزید یہ کہ دوسری قومیں جن راہوں اور ذریعوں سے ترقی کر کے دوسروں پر غالب آ رہی ہیں، ان سے ناواقفیت پر اس قوم کو نہ صرف خسارہ میں رہنا پڑے گا بلکہ ان غیروں کا دست نگر اور تابع مہمل بننا پڑے گا۔ عالم اسلام کی قوتیں کئی صدیوں سے اس احساس میں مبتلا رہی ہیں اور ابھی کچھ تھوڑی بیداری کے باوجود اس ورطہ سے نہیں نکل سکی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اہل دین، جن کی قیادت و رہنمائی میں وہ جامع اور موثر رہنمائی بنتی ہے جس کے اثر سے مسلم قوم عظمت و قوت کے میدان سر کر سکتی ہے، وہ عظمت و قوت کے حصول کے لیے قدیم اختیار کردہ ذرائع کو مقاصد کا درجہ دینے لگے ہیں اور ذرائع کے معاملہ میں روز افزوں تجربوں سے جو تبدیلی اور بہتری کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں، ان کو اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ علم و ثقافت کے میدان میں اس عہد اخیر میں جو توسع پیدا ہو چکا ہے، اس کو بھی ہمارے اہل دین اپنے نظام تعلیم میں نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے دینی نظام تعلیم کی بقاء و کامیابی کے سلسلہ میں بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم کو علم و ثقافت کی اس وسعت کو سمجھنا اور اس کے ضروری حصہ کو لینا ہو گا۔ اس کے لیے اس وقت علم و ثقافت میں جو وسعت پیدا ہو گئی ہے اس کو دیکھنا ہو گا۔

کر کے ان میں سے ہر ایک کی ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے اس کو نظام تعلیم میں جگہ دینا ہوگی اور ان کی الگ الگ مقدار متعین کرنا ہوگی۔ کسی علم و مضمون کو وسیع اور بنیادی درجہ دینا ہوگا اور کسی کو صرف ضمنی اور متعلق کا درجہ دینا ہوگا۔

اسکول ہوں یا مدارس، یونیورسٹیاں ہوں یا جامعات اسلامیہ، سب کو اپنے مقصد کے مطابق ہی علوم و مضامین درس کی نوعیت و ترتیب کا عمل کرنا ہوتا ہے۔ عصری اسکول اور یونیورسٹیاں تعلیمی عمل سے کامیاب اور کارپرداز شہری تیار کرنے کا مقصد رکھتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب و کارپرداز شہری کے لیے جن علوم کی جو اہمیت اس کی انفرادی ضرورت کے لیے اور عام قومی و وطنی ضرورت کے لیے ہوتی ہے، اس اہمیت اور ضرورت کی مقدار کے مطابق ان علوم کو اختیار کرتے ہیں اور ان کی تعلیم کا اور ان کی تدریس کا نظم کرتے ہیں۔ اس میں زبان و ادب، سماجی علوم اور سائنسی علوم کی بڑی شاخوں کو لیا جاتا ہے۔ اگر یہ اسکول و کالج اسلام بیزار نہیں ہیں تو سماجی علوم کے اندر مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو ایک چھوٹا سا حصہ دے دیتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب بیزار ہیں تو مذہبی تعلیمات کو شامل ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو مضر سمجھتے ہیں۔

مذہب پسند اسکول و کالج بھی یورپ سے متاثر ہونے کے باعث مذہبی تعلیمات کے لیے اپنے نظام میں بہت معمولی جگہ نکالتے ہیں، اس سے کسی حد تک مذہبی تعلیمات سے تعارف تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن مذہبی تعلیمات سے ضروری واقفیت نہیں ہوتی۔ ان کو بھی اپنے نظام تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ استعماری طاقتوں کے چھوڑے ہوئے نظام میں وہ اپنی ضرورت اور خصوصیت کے لحاظ سے ضروری ترمیم بھی ابھی تک نہیں کر سکے۔ اسی وجہ سے اس نظام تعلیم سے تیار ہونے والے لوگ مسلمان شہری کم، مغربی شہری زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ شان و شوکت و عظمت کے حامل مغرب کی عطا کردہ تعلیم کے حامل ہونے کے باعث ایک طرح سے زائد احساس برتری بھی رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ علماء اور اہل دین کو علم و تعلیم کے مسئلہ میں خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے تجربوں کو کم از کم واقفیت کے حصول کے لیے بھی ٹھیک سے معلوم کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ ان کی کمی ہے جس کی طرف ان کو توجہ کرنا چاہیے۔

دوسری طرف ہمارے قدیم نصاب کے دینی مدارس میں جنہوں نے حالات زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے اپنے نصاب میں تجدید و توسیع نہیں کی ہے جس کے سبب ان کے فضلا زندگی کے ان شعبہ میں صحیح واقفیت نہ پاتے ہیں جس میں واقفیت وقت کے

اہم تقاضوں میں ہے۔

لیکن اس کے باوجود خالص دینی ضرورت اور صرف مذہبی علوم میں واقفیت کے دائرے میں ان کی افادیت غیر معمولی ہے اور ملک میں شریعت اسلامی کی حفاظت و بقاء کا اصل سہرا انہی فضلاء کے سر ہے۔ ان مدارس کے نصاب میں ان کے علوم سے مطابقت رکھنے والے مضامین کا اضافہ تو ضروری ہے لیکن ان کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کو ملانے کی دعوت دینا بے جوڑ بات ہے۔ پھر ان مدارس کو ان کے محدود دینی دائرے میں رہنے دیا جائے تو کم از کم اس دائرے کی ضرورت کا نظم تو ان کے ذریعہ قائم رہے گا جو بذات خود ایک بہت مفید بات ہے۔ پھر ان مدارس کی تعداد پورے نظام تعلیم میں دو تین فیصد سے زیادہ نہیں ہے، اتنی تعداد سے زیادہ تو علوم عصریہ کے نظام میں ایک ایک صنف میں محدود ہو کر تعلیم حاصل کرنے والوں کی ہے، مگر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ میڈیکل کالج میں انجینئرنگ بھی سکھائی جائے یا انجینئرنگ کے شعبہ میں میڈیکل سائنس بھی پڑھائی جائے۔ قانون کے شعبہ میں آرٹ کی تعلیم بھی ضرور رکھی جائے۔ اسی صورت میں یہ مطالبہ کہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں ٹیکنیکل علوم باقاعدہ پڑھائے جائیں، ایک بے وزن قسم کا مطالبہ ہے۔ البتہ ثبوعات کے مبادیات کو ان کے کسی مرحلہ میں شامل کرنے میں حرج نہیں، لیکن ان دینی مدارس میں ان کے بنیادی علم کو کم کر کے جن کا وہاں اختصاص پیدا کیا جا رہا ہو، طبعی علم کو وسیع جگہ دی جانے کی بات کسی جائے تو بغیر غور کے کہی جانے والی بات شمار ہوگی۔ البتہ دوسری طرف مدارس اسلامیہ عربیہ سے جو بات کہنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ قوم و ملت کی رہنمائی اور اس کی مذہبی و اخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان مدارس میں جو آدمی تیار کیے جا رہے ہیں، ان کی ضرورت کے لائق مضامین کا انتخاب اور ان کی تعلیم کا بہتر سے بہتر طریقہ جو خواہ اپنوں کے تجربوں میں آیا ہو خواہ غیروں کے تجربے میں، ان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ ان سے گریز اپنے نظام کو ناکام بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

مدارس اسلامیہ عربیہ کے علوم کے اصناف کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان علوم کی اصناف بھی تین ہیں۔ ایک مذہبی بنیادی علوم کی، دوسرے اسلامی ضرورت کے لسانی و سماجی علوم کی، تیسرے زندگی کے متعلق عام معلومات کی۔ یہ زندگی وہی ہے جس میں علماء دین اور رہبران ملت کو بھی رہنا ہوتا ہے۔ کیا وہ ان کے بارے میں ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح رہنا چاہیں گے؟ اگر ایسا نہیں تو زندگی کی اس ضرورت کے تعلق سے ان کو واقفیت پیدا کرنا ہوگی اور جہاں تک سماجی علوم کا تعلق ہے، ان کے علم کے علاوہ سے بھی بڑی

اہمیت کے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کی اسلامی فکر و ثقافت کو سائنسی علوم سے نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ تو تسلیم شدہ اور مشاہدہ سے ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں جو فطری ہیں۔ وہ کسی مذہب سے متصادم ہوں تو ہوں، اسلام سے کہیں متصادم نہیں ہوتے ہیں۔ اصل نقصان تو سماجی علوم کو مخالفانہ یا معاندانہ انداز میں مرتب کرنے اور پیش کرنے سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے جن سے یورپ پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس طرح ادب و زبان سے اچھی واقفیت اور ان پر قدرت بھی ذہنوں کو جتنا متاثر کرتی ہے، دوسری صلاحیتیں مشکل سے اتنا اثر انداز ہوتی ہیں۔ یورپ کی قومیں اور ان کے مشرقی شاگرد علوم و آداب کے میدان میں اس وقت جتنے قابو یافتہ ہیں، وہ کوئی مخفی بات نہیں، پھر یہ مغربی ذہن کے لوگ سماجی علوم کی راہ سے مشرقی ذہنوں کو مسلمانوں کے سرمایہ فکر و ثقافت بلکہ عقائد و مسلمات کے سلسلہ میں جتنا متزلزل کرتے رہے ہیں اور کر رہے، اس نے اسلامی فکر و عقیدہ کے لیے ایک بڑا خطرہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کی اکثریت اس میدان میں بھی ہے اور ذرائع ابلاغ و ادب کے میدان میں بھی ہے اور ان کو ان کی مہارت بھی زیادہ ہے۔ اس صورت حال میں اگر موثر اور طاقت اور ذرائع اختیار نہیں کیے گئے تو بنیادی دینی علوم کی حفاظت اور دفاع بھی زیادہ عرصہ تک نہ کیا جاسکے گا۔ دشمن کو اس کے ہتھیار سے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں سماجی علوم کا بھی حصہ شامل کیا جائے۔ اور عصری زندگی سے تعلق رکھنے والی ضروری معلومات بھی خواہ بقدر تعارف ہوں، رکھی جائیں۔ اسی کے ساتھ زبان و ادب کو بھی وہ مقام دیا جائے، جس کی ضرورت حالیہ عہد کے لحاظ سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مضامین کے اس تنوع و توسع اور درجہ بندی کے لیے تعلیمی مدت بھی اسی کے مطابق کرنا ہوگی۔ اس کے لیے عصری تعلیم گاہوں کا مرحلہ واری طریقہ اپنانا مناسب ہے۔ جہاں تعلیمی مدت ابتداء سے انتہا تک ۱۷، ۱۸ سال کی ہوتی ہے۔ شروع کے پانچ سال ابتدائی کے، پھر تین سال متوسط کے، پھر دو تین سال ثانوی کے پھر چار سال عالی کے، پھر دو سال اعلیٰ و تخصص کے۔

ابتدائی و متوسط درجات میں ابتدائی و میانیات اور زندگی کے متعلق عام بنیادی معلومات و مضامین پڑھانا موزوں ہے جو ان درجات کے طلباء کی عمر کے مطابق سہل الفہم ہوں۔ پھر ثانوی میں مضامین کچھ محدود کیے جائیں اور بنیادی ضرورت کے مضامین کو زیادہ وقت اور اہمیت دی جائے۔ اپنے اپنے مقصد کے مطابق ان کا تعین ہو۔ پھر عالی میں خالص اپنے مقصد کے ساتھ مخصوص مضامین کی جانیں دیں۔

تھوڑے اور محدود ضرورت کے لیے۔

جامع دینی تعلیم کا ایک تجربہ - ندوۃ العلماء

دراصل موجودہ بدلتی ہوئی دنیا کے پیش نظر ضرورت تھی کہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی وسعت کا حق ادا کرتے ہوئے وقت کے تقاضا کا خیال رکھا جائے۔ علوم اجتماعی میں متعدد علوم وسیع اور مفید علم بن چکے ہیں جن سے عالمانہ واقفیت کے بغیر نہ تو ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ مشرق پر اس کے جو گوناگوں منفی اثرات پڑ رہے ہیں، ان کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک مسلمان کو اگر اسلام سے نبرد آزما طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور اپنے کو اپنی امت کو ان کے شر سے بچانا ہے تو اس کو ان تمام موضوعات سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ندوۃ العلماء کی اصلاح نصاب کی دعوت نے اپنے قیام ۱۸۹۳ء سے ہی وقت کے تقاضا کے مطابق نصاب تعلیم کی تشکیل کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اور اس کی دعوت دی تھی۔ اس کے لیے اس نے علوم دینیہ کا پورا حق رکھتے ہوئے ضروری نئے موضوعات کو شامل کرنے کا خاکہ مرتب کیا اور نصاب بنایا، اور کام کی ابتداء کی۔ لیکن اس کو جن وسائل کی ضرورت تھی، وہ اس کو لوگوں کی طرف سے توجہ نہ ملنے اور تعاون کم دیے جانے کی وجہ سے نہ مل سکے۔ چنانچہ رفتار ست رہی اور ضرورت کے تمام گوشے اپنائے نہ جاسکے۔ پھر بھی اس کے اس تجربہ کے بتدریج نتائج سامنے آنے لگے تو اس تجربہ کو قریب سے دیکھنے والوں کو اس مسئلہ پر غور کرنے اور اس کے لحاظ سے قدم اٹھانے کی ضرورت کا احساس بڑھا۔ یہ اگرچہ خاصی تاخیر سے ہوا لیکن پھر یہ ایک خوش آئند عمل کہا جانے کا مستحق ہے۔

ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب کے مضامین کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک علوم دینیہ، جو اس کے نصاب کا غالب حصہ ہیں۔ دوسرے لسانی مضامین جن کو وقت اور ضرورت کے لحاظ سے قدیم اور جدید دونوں پہلوؤں سے اپنایا گیا ہے۔ تیسرے علوم اجتماعیہ جو اسلام اور ملت اسلام کے تعلق سے ضروری ہیں۔ ان تینوں اقسام میں زیادہ توجہ علوم دینیہ پر، پھر لسانیات پر، پھر علوم اجتماعیہ پر دی گئی ہے۔ علوم دینیہ کے دائرے میں قدیم مدارس عربیہ کے نصاب سے تقریباً پوری یکسانی ہے۔ اس کے مروجہ نصاب میں کتر بیونت نہیں کی گئی۔ البتہ ان کو زیادہ وسیع مدت میں پھیلایا گیا ہے تا کہ وہ پورے ہو سکیں اور ان کا حق زیادہ بہتر طریقہ سے ادا ہو سکے۔ چنانچہ کتب حدیث و فقہ اسی مقدار میں اور تقریباً انہی کتب کی صورت میں شامل ہیں۔

درس نظامی کے دورہ حدیث کی کتب کو ایک سال کے بجائے تین سالوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس سے قبل مشکوٰۃ شریف دو سال میں رکھی گئی ہے۔ پھر تین سال میں کتب صحاح رکھی گئی ہیں۔ فقہ میں مروجہ کتب کے ساتھ فقہ علی المذاہب الاربعہ سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مسائل حاضرہ کا تعارف بھی رکھا گیا ہے۔ تفسیر متن قرآن اور بیضاوی (برہ) پانچ سالوں میں مع اصول تفسیر داخل نصاب ہے۔ تغیر اور کمی کا عمل اصلاً علوم عقلیہ قدیم میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ عہد اور ثقافت بدل جانے کی وجہ سے اب اسلامی علوم کی ترویج اور اسلامی فکر کا دفاع قدیم علوم عقلیہ کا زیادہ محتاج نہیں رہا۔ اب اس کی بڑی جگہ علم انفس، ادب اور لسانیات نے لی ہے۔ اس لیے منطق و فلسفہ کے صرف مبادی اور ضروری پہلوؤں سے تعارف کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ ضرورت جدید فلسفہ کو پڑھانے کی ہے جس کا رواج جدید علمی دنیا میں بڑھا ہوا ہے۔ لسانیات کے دائرے میں عربی زبان کی وسیع علمی و عملی تعلیم و مہارت کے ساتھ اردو میں اور اس کے بعد انگریزی، فارسی اور ہندی زبانوں سے واقفیت پیدا کی گئی۔ عربی اردو کے بعد دیگر زبانوں میں انگریزی زبان کی تعلیم کو زیادہ وقت دیا گیا ہے اور اس کو بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ وہ ابتدائی مرحلہ کے بعد شروع ہوتی ہے اور عالی مرحلہ میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ جہاں اس کے انٹر میڈیٹ تک کا نصاب پورا ہوتا ہے۔ علوم اجتماعیہ میں تاریخ، جغرافیہ، ثقافت اسلامی، اسلامی فکر اور منحرف فکر و باطل نظریات کا تعارف، اقتصادیات اور سیاسیات کے مبادی اور ریاضی وغیرہ نصاب میں رکھے گئے ہیں۔ نیز اہم مفکرین کے محاضرات کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے مراحل کو ابتدائی، ثانوی اور عالی اور تخصص کے مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان ہی کی مناسبت سے مضامین نصاب کی ترتیب و تنسیق رکھی گئی ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں جو ۶ سالوں پر پھیلا ہوا ہے، ناظرہ قرآن و حفظ سورہ منسحبہ و تجوید، عقائد دینیہ و مسائل فقہیہ، اسلامی معلومات، تاریخ اسلام، اردو، ہندی، فارسی، حساب، جغرافیہ، معلومات جدیدہ اور خطوط نویسی، خوش خطی اور بعض دیگر معلوماتی اسباق ہیں اور عصری مدارس کی سطح کا معیار رکھا گیا ہے۔

ثانوی مرحلہ میں جو پانچ سالوں پر مشتمل ہے، عربی زبان و ادب و انشاء، اردو ادب و فارسی، انگریزی زبان، فقہ، معلومات دینیہ، سیرت نبوی، منتخب احادیث، صرف و نحو، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور دیگر معلوماتی مضامین ہیں۔

درجات عالیہ کے چار سالوں میں ترجمہ و تفسیر قرآن اور متداولہ کتب تفسیر کی مراعات نیز بیضاوی سورہ برہ و اصول تفسیر، مع اصول حدیث، فقہ، اصول

فقہ، عقائد، ادب عربی و انشاء، نحو، تاریخ، ادب، نقد ادب، تاریخ اسلامی، جغرافیہ اسلامی، ثقافت اسلامی، دعوت اسلامی، منطق و فلسفہ، سیاسیات و معاشیات اور انگریزی ہے۔

فضیلت و تخصص کے مرحلہ میں بقیہ کتب صحاح ہیں۔ مع طحاوی و اصول حدیث، علوم قرآن و تفسیر کشف، اسرار عبوات، اسرار شریعت، فقہ و اصول فقہ، تاریخ علوم، ادب عربی و انشاء، تاریخ دعوت و فکر اسلامی، تراجم علماء و اعلام، اصول تعلیم اور بعض دیگر مضامین شامل ہیں۔ قدیم مدارس دینیہ میں حدیث و فقہ کا جو نصاب دو یا تین آخری سالوں میں ہوتا ہے، وہ نصاب ندوہ نے مضامین کے اضافے کی وجہ سے پانچ سالوں میں پھیلایا ہے تا کہ وہ پورے ہو سکیں۔ اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ انگریزی اور عصری مضامین کے داخل نصاب کرنے سے علوم دینیہ کو نقصان نہ پہنچے۔ اس کے ساتھ دینی اخلاق و کردار کی حفاظت کے لیے اساتذہ اور نگرانی دارالافتاء کے وسیع نظام سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح عصری مضامین اور انگریزی سے اسلامی اخلاقی کردار کو نقصان نہیں پہنچتا۔

جس کا کام مطلوبہ خطوط پر بتدریج انجام دیا گیا، جو نصاب تعلیم کے دائرہ میں اس تفصیل سے ہے جس کا سطور بالا میں تعارف کرایا گیا۔ یہ دینی تعلیم کو عصری تقاضوں کے ساتھ مربوط کرنے کے مقصد سے ہوا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے عصری مدارس و جامعات بھی انقلابی قدم اٹھائیں اور اپنے نصاب تعلیم میں وہ ضروری اضافہ کریں جس سے وہاں کے طلباء صرف علم ہی حاصل کر کے ہی نہ رہ جائیں بلکہ وہ اپنی اور امت اسلامیہ کی صلاحیت و مقام پر اعتماد بھی حاصل کر سکیں بلکہ دنیا کے سامنے اعتماد کے ساتھ اپنی اور دینی برتر خصوصیات سے اثر انداز ہوں۔ ضرورت ہے کہ وہاں کے ماہرین تاریخ موقر مغربی زبانوں میں اسلام و مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں اور بے اعتمادی پیدا کی گئی ہے، اس کو اپنی تصنیف کردہ ٹھوس علمی کتابوں سے دور کریں اور اسلام اور مسلمانوں کا شاندار چہرہ واضح کریں۔ اسی طرح دیگر سماجی اور انسانی علوم میں ایسا علمی سرمایہ تیار کر دیں جو مسلمانوں کا باعزت مقام بحال کرتا ہو اور نئی نسل کے کچے ذہنوں کی صحیح رہنمائی بھی کرتا ہو۔ یہ کام ہماری مسلم عصری درسگاہوں اور مسلم اسکالروں کے ذمہ قرض ہے جس کو انہیں جلد از جلد اٹارنا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسان سازی ہے۔ انسان سازی کا مطلب وہ انسان بنانا ہے جو اپنے مسئلہ منہجیات، معتبر اخلاق اور پختہ دین و ایمان کا حامل ہو نہ کہ ہر چمکتی چیز کا دلدادہ اور دوسروں کی کسی بھی برتری کے سامنے مبہوت ہو کر اپنی ہر خصوصیت کا منکر ہو جائے۔